© rasailojaraid.com



پروفیسر محمد اسلم

# حدیث اور تاریخ کا باہمی ربط اور امتیاز

حدیث اور تاریخ کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ہماری ابتدائی تاریخوں میں جو واقعات درج ہیں انھیں محدثین کے طریق پر ہی مختلف راویوں کی زبانی نقل کیا گیا ہے، اس کے باوجود حدیث اور تاریخ کے راویوں کی سیرت اور کردار میں کافی فرق ہے۔ جس طریقے سے محدثین کرام نے حدیث کے راویوں کے کردار اور دیانت کی جانچ پڑتال کی ہے اس طرح مؤرخین نے اپنے راویوں کی دیانت اور ثقاہت کو نہیں پرکھا۔ اس لیے تاریخ میں رطب و یابس بھی جمع ہو گیا ہے۔

روایت حدیث کے بارے میں راویوں نے بڑی احتیاط سے کام لیا ہے۔ نبی علیہ الصلوٰۃ و السلام کا یہ فرمان ہر وقت ان کے پیشِ نظر رہتا تھا کہ اگر کوئی شخص غلط بات حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف منسوب کرے تو اس کا ٹھکانہ جہنم میں ہوگا۔ اس لیے راوی، حدیث بیان کرتے ہوئے خوفِ خدا سے لرزاں و ترساں رہتے تھے اور انھیں اگر حدیث کے الفاظ من وعن یاد نہیں ہوتے تھے تو وہ یہ کہہ دیتے تھے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ قریب قریب یہی تھے۔

مؤرخوں کے برعکس محدثینِ کرام کسی راوی سے حدیث قبول کرنے سے قبل اس کے سیرت و کردار، دیانت و امانت اور حافظے پر جرح کرتے ہیں۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ راوی کا کردار مشکوک ہے، یا جس راوی سے وہ خود روایت کر رہا ہے اس کے ساتھ اس کا لقا ثابت نہیں، یا یہ معلوم ہو جائے کہ اس راوی نے کبھی جھوٹ بولا ہے یا اسے جھوٹی گواہی دینے کے جرم میں عدالت سے سزا ملی ہے، یا اس نے کسی شرعی حد کو توڑا ہے تو پھر محدثین کرام ایسے شخص سے حدیث قبول نہیں کرتے۔ اس ضمن میں امام محمد بن اسمٰعیل بخاریؒ کے اس واقعہ کا ذکر بے جا نہ ہوگا۔ روایت ہے کہ امام موصوف کو یہ معلوم ہوا کہ ایک دور افتادہ گاؤں میں ایک ایسا راوی موجود ہے جو بڑی معتبر سند کے ساتھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث روایت کرتا ہے۔ امام صاحب کئی روز کی مسافت طے کر کے اس گاؤں میں پہنچے تو دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ راوی اپنے کھیت میں ہے۔ آپ اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے کھیت میں پہنچے تو انھوں نے دیکھا کہ اس کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



نموڑا کھل گیا ہے اور وہ اسے پکڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ جتنا گھوڑے کے قریب جاتا وہ اتنا ہی بدک کر دور بھاگ جاتا۔ اس شخص کو ایک ترکیب سوجھی۔ اس نے اپنی جھولی پھیلا کر گھوڑے کو پچکارا تو وہ دانے کے لالچ میں قریب آگیا۔ اس نے جھٹ سے اسے پکڑ لیا۔ امام بخاریؒ یہ منظر دیکھ کر پیچھے مڑے تو اس نے آواز دی۔ امام صاحب رک گئے تو اس نے ان کا نام پوچھا اور تشریف آوری کا مقصد پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ انھیں معلوم ہوا تھا کہ اس کے پاس ایک حدیث بسندِ معتبر موجود ہے، وہ اس کی سماعت کے لیے اتنی مسافت طے کر کے آئے تھے۔ اس نے کہا کہ پھر وہ حدیث سن لیجیے۔ امام صاحب نے فرمایا کہ وہ اب وہ حدیث نہیں سنیں گے۔ اس نے وجہ پوچھی تو امام موصوف نے فرمایا کہ جو شخص ایک جانور کو دھوکا دے سکتا ہے، وہ انسانوں کو بھی چکمہ دے سکتا ہے۔ اس نے گھوڑے کو دھوکا دے کر اپنی ثقاہت اور دیانت مجروح کر لی ہے، لہٰذا اب وہ اس سے حدیث قبول نہیں کر سکتے۔

اس واقعہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر کسی راوی کے پاس حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی صحیح حدیث ہو لیکن راوی کی سیرت و کردار مشکوک ہو تو اس کا اعتبار باقی نہیں رہتا۔ محدثینِ کرام نے حدیث قبول کرنے کے لیے جو کڑا معیار قائم کیا تھا اس کا عشرِ عشیر بھی مورخوں کے ہاں نہیں ملتا۔ حدیث اور تاریخ میں ایک نمایاں فرق تو یہ ہے کہ حدیث بڑی چھان بین اور احتیاط کے بعد قبول کی جاتی ہے لیکن تاریخی واقعات میں جھوٹ سچ سب کچھ چل جاتا ہے۔ امام احمد بن حنبل کا قول ہے کہ تین قسم کی کتابیں زیادہ قابلِ اعتماد نہیں ہیں، یعنی مغازی، تفسیر اور شورشوں کی کتابیں۔ قاضی ابوالولید فرماتے ہیں کہ اہلِ سیر کی روایت پر محدثینِ کرام اعتماد نہیں کرتے۔ مورخین نے سلسلۂ اسناد کا خاص اہتمام نہیں کیا اور اگر کہیں سند بھی بیان کی ہے تو اس کی چھان پھٹک محدثین کرام کے طریق پر نہیں کی۔

محدثین کرام نے روایات کو مختلف اقسام میں تقسیم کیا ہے، ان کے ہاں روایات کا معیار حسن، عزیز، تواتر، مرسل، منقطع، موضوع اور ضعیف کے اعتبار سے متعین کیا جاتا ہے لیکن تاریخ میں ہر طرح کی روایت چل جاتی ہے۔ اس لیے حدیث کے مقابلے میں تاریخ کی کوئی حیثیت نہیں۔ یوں بھی تاریخ کا کوئی معیار نہیں۔ ہم نے بارہا یہ مشاہدہ کیا ہے کہ جب کوئی شخص برسرِ اقتدار ہوتا ہے تو اس کی شان میں بڑے مبالغہ آمیز قصیدے لکھے جاتے ہیں، اس کے بیانات کی خوب تشہیر کی جاتی ہے، اس کی شخصیت کو خوب اجاگر کیا جاتا ہے، اس کے اقوال و دیگر اعمال پر کتنے لکھے جاتے ہیں، اس کی خدمت میں سپاسنامے پیش کیے جاتے ہیں اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



جب وہ اقتدار سے الگ ہو جاتا ہے تو اس کی مذمت میں کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ اس کی قائم کردہ یادگاریں مٹائی جاتی ہیں، نصابی کتابوں سے اس کا ذکر حذف کیا جاتا ہے اور دنیا بھر کی برائیاں اس کی ذات میں جمع ہو جاتی ہیں، اس کے شجرے چھاپ کر اسے مجہول النسب ثابت کیا جاتا ہے، اس لیے تاریخ کسی شخص کی شخصیت اور کارناموں کو پرکھنے کا کوئی معیار نہیں۔

محدث اور مورخ میں ایک نمایاں فرق ہوتا ہے۔ محدثین کرام کی اکثریت شاہی درباروں اور سیاسی جھمیلوں سے دور رہ کر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی احادیث کی تدوین اور چھان بین میں لگی رہی، اور مورخوں کی اکثریت شاہی درباروں میں زلہ ربائی کر کے حکمرانوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ان کی مرضی کے مطابق تاریخیں مرتب کرتی رہی۔ یہاں ابو الفضل کی مثال بے جا نہ ہوگی جس نے اکبر کے ہر جائز و ناجائز کام کو پیلنگن کی بجائے شاہ کے ملازم کی حیثیت سے بڑے دھڑلے کے ساتھ پیش کیا۔

محدث اور مورخ میں ایک بنیادی فرق یہ بھی ہے کہ محدث غیر جانب دار ہوتا ہے۔ اس کے اپنے مقرر کردہ معیار پر جو حدیث پوری اترتی ہے وہ اسے لے لیتا ہے، لیکن مورخ کے لیے غیر جانب دار رہنا بڑا مشکل ہے۔ تاریخ لکھتے وقت اس کا ذاتی رجحان، فقہی مسلک، دبستانِ علم اور سیاسی وابستگی اُسے جانب دار بنا دیتی ہے۔ آج ہم کسی بڑے سے بڑے مورخ کو بھی غیر جانب دار نہیں کہہ سکتے، کیونکہ کہیں نہ کہیں وہ ذاتی رجحان، فقہی مسلک، گروہی یا نسلی تعصب یا سیاسی وابستگی کی رو میں بہہ جاتا ہے۔

حدیث کے صحیح ہونے کا ایک معیار یہ بھی ہے کہ وہ قرآن مجید کی نص کے خلاف نہ ہو۔ اسی طرح تاریخ کے لیے بھی ایسی ہی شرط ہونی چاہیے تھی کہ وہ قرآن و حدیث کے خلاف نہ ہو اور درایت کے اصول پر بھی پوری اترتی ہو۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ بعض مورخوں نے اپنی تصانیف میں بہت سے ایسے واقعات شامل کر دیے ہیں جو تعلیماتِ قرآن کے خلاف ہیں اور ان کا وقوع پذیر ہونا محال ہے۔

میرا ہمیشہ ہی سے یہ عقیدہ رہا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک، عہدِ خلافتِ راشدہ اور اموی عہد کی تاریخ صحیح طور پر نہیں لکھی گئی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ تاریخ نویسی کا باقاعدہ آغاز عباسی عہد میں ہوا۔ عباسیوں نے اموی حکمرانوں کے آخری عہدِ حکومت میں ان کے خلاف طرح طرح کے الزامات تراشے۔ عباسیوں کے کارندوں نے امویوں کے جور و تشدد کے واقعات کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔ اسی طرح حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے بھی امویوں کو خوب بدنام کیا۔ اس پروپیگنڈا کا یہ اثر ہوا کہ خلفائے بنی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



وخراسان میں ان کے خلاف بغاوت ہو گئی اور آخری اموی خلیفہ مروان ثانی کو جنگ زاب میں شکست دے کر ابو عبداللہ السفاح عباسی کو مسند خلافت پر بٹھا دیا۔

جب تاریخ نویسی کا آغاز ہوا تو اس وقت امویوں کے خلاف اتنا پروپیگنڈا ہو چکا تھا کہ ان کے اصلی خدوخال اور کارناموں پر غلط بیانی کی دبیز تہیں چڑھ چکی تھیں اور مورخوں نے ان کے حالات قلم بند کرتے وقت چھان پھٹک کیے بغیر تمام رطب و یابس اپنی تصانیف میں شامل کر لیا۔ یوں بھی عباسی عہد میں امویوں کے حق میں کلمۂ خیر کہنا اپنی موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ اس لیے عباسی عہد کے مورخوں کے لیے یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ اپنی تصانیف میں ان کے سیاسی مخالفین کا ذکر اچھے انداز میں کرتے، لہٰذا انھوں نے زمانے بھر کی برائیاں امویوں کے کھاتے میں ڈال دیں۔

میں اس کی مثال عموماً یوں دیا کرتا ہوں کہ برصغیر کی تاریخ میں جتنا کام شیر شاہ سوری نے چار سال میں کیا اتنا کام اکبر اور اورنگ زیب عالم گیر پچاس پچاس سال میں نہ کر سکے۔ شیر شاہ سوری کے جانشین اسلام شاہ نے اپنے عظیم والد کے کام کو آگے بڑھایا اور اسے دُگنا کر دکھایا، لیکن یہ ان باپ بیٹوں کی بدقسمتی ہے کہ ان کی تاریخیں ان کے اپنے عہد کی بجائے اکبر اور جہاں گیر کے درباری مؤرخوں نے لکھیں۔ اکبر کے والد اور جہاں گیر کے دادا ہمایوں کو تخت سے محروم کرنے اور پندرہ سال تک برصغیر سے جلاوطن کرنے والے سوری حکمرانوں کے حق میں اکبر اور جہاں گیر کے تنخواہ دار مؤرخ کس طرح کلمۂ خیر لکھ سکتے تھے۔ اکبر کے وزیر اور خوشامدی مؤرخ ابوالفضل نے اسلام شاہ کی فوجی قوت اور جنگی مہارت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے کہ اگر وہ اکبر کا منصب دار ہوتا تو سرحدوں کی حفاظت بڑے احسن طریقے سے کر سکتا تھا۔ بالکل یہی معاملہ امویوں کے ساتھ پیش آیا کہ ان کے عہد کی تاریخ ان کے جانی دشمنوں کے عہد میں لکھی گئی اور جن اموی خلفا نے سپین فتح کر کے فرانس کی سرحدوں تک اسلام کے پرچم لہرا دیے، جنھوں نے بحیرۂ عرب کے ساحل سے لے کر ملتان تک کا علاقہ فتح کر کے اسے برصغیر کا باب الاسلام بنا دیا، جنھوں نے دریائے سیحون عبور کر کے چین کی سرحد تک اسلامی حکومت قائم کر دی، ان کے سنہری کارناموں پر پانی پھیر دیا۔

خلفائے راشدین، جن کے بارے میں مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین المھدیین کے ساتھ بھی مورخوں نے انصاف نہیں کیا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ عہدِ صدیقی میں ایرانیوں کو جنگ ذات السلاسل، جنگ مذار، جنگ دلجہ، جنگ اُلیس اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



جنگ انبار میں شکست ہوئی اور ان کے عظیم جرنیل مسلمانوں کے مقابلے میں ناکام رہے۔ عہدِ فاروقی میں ان کو قادسیہ، نہاوند اور مدائن کی جنگوں میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا اور ایران کی قسمت کا ہمیشہ کے لیے فیصلہ ہوگیا۔ عہدِ عثمانی میں آخری ساسانی تاجدار یزدجرد مارا گیا اور کسریٰ کے خاندان کا چراغ ابدالآباد کے لیے گل ہوگیا۔ ایران کی ساسانی حکومت صفحۂ ہستی سے مٹ گئی اور اس کی جگہ اسلامی حکومت قائم ہوگئی۔ کسریٰ کی مسند پر امیر المومنین عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور پھر امیر المومنین عثمان غنی رضی اللہ عنہ رونق افروز ہوئے۔ ایران کا آتش کدہ، جو ہزار برس سے روشن تھا، سرد پڑ گیا اور ایران کے ہر شہر اور قصبے میں مسجدیں تعمیر ہوگئیں۔ مجوسی مذہب کی جگہ اسلام نے لی، زند، پاژند اور اوستا کے صفحات الٹ گئے اور ان کی جگہ اللہ کی آخری کتاب قرآنِ مجید نے لی۔ ساسانی تہذیب کی جگہ اسلامی تہذیب نے فروغ پایا۔ بازارِ سخن میں پہلوی زبان کا چلن بند ہوگیا اور اس کی جگہ عربی نے رواج پایا۔ ایرانی حکام نے اپنی بساط لپیٹی اور ان کی جگہ عرب عہدے دار مقرر ہوئے۔ ایرانی اپنے وطن پر عربوں کا تسلط کسی صورت بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ انھوں نے عربوں سے بدلہ لینے کے لیے ان کی تاریخ کو مسخ کر ڈالا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، عمر رضی اللہ عنہ، عثمان رضی اللہ عنہ اور ان تمام صحابۂ کبار رضی اللہ عنہم کو جو بالواسطہ ایران کی فتح میں شریک تھے، مطعون ٹھہرایا۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ مفتوح قوم کے مورخ فاتح قوم کی تاریخ لکھتے وقت اپنے دل کی بھڑاس نکالتے ہیں۔ بالکل یہی معاملہ ابتدائی دورِ اسلام کی تاریخ کے ساتھ پیش آیا۔

ہمارے وہ مورخ جنھوں نے خیر القرون کی تاریخیں مرتب کی ہیں ان میں زیادہ تر مورخ مجوسی النسل یا عجمی ذہن کے مالک تھے۔ ان کی اکثریت سبائی اور عباسی پروپیگنڈے سے بری طرح متاثر نظر آتی ہے۔ محدثینِ کرام نے جب ان مورخوں اور ان کے راویوں کی سیرت اور کردار کی اپنے مقرر کردہ معیار پر چھان پھٹک کی تو انھوں نے اعثم کوفی، ابی مخنف لوط، ابن ابی الحدید، ابراہیم بن محمد ثقفی، ابو احمد جلودی، ہشام بن محمد کلبی، نصر بن مزاحم، واقدی اور محمد بن سائب کلبی وغیرہ کو ضعیف اور وضاع ہونے کا سرٹیفیکیٹ عطا کیا۔ تاریخ الخلفا کے مصنف علامہ جلال الدین محدث سیوطی، جنھیں بعض لوگ نویں صدی کا مجدد تسلیم کرتے ہیں، حاطب اللیل کہلائے۔

بعض مورخوں نے خیر القرون کی تاریخ کو مسخ کرکے ہمارے اکابر کی سیرت و کردار کو مشکوک بنانے کی کوشش کی ہے۔ میرا یہ عقیدہ ہے کہ جس برگزیدہ گروہ کی تعلیم و تربیت اور تزکیۂ نفس کا اہتمام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ کے فرمانِ خداوندی کے مطابق معلم اخلاق اور محسنِ انسانیت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہو اور جنھیں خالق ارض و سما نے كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ میں کہہ کر مخاطب کیا ہو، اس گروہ اور اس مبارک عہد کی تاریخ بھی خیر التواریخ ہونی چاہیے۔ انھی کے زمانے میں اللہ تعالیٰ کے وہ وعدے، جو اس نے قرآن مجید میں اپنے نیک بندوں کے ساتھ کیے تھے، پورے ہوئے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وہ برگزیدہ ساتھی جنھیں اللہ تبارک و تعالیٰ نے رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ فرمایا اور جن کے بارے میں یہ ارشادِ خداوندی ہوا لو انفقت ما فی الارض جمیعا ما الفت بین قلوبهم ولكن الله الف بينهم انھیں بعض تاریخ نگاروں نے باہم دست و گریبان ہوتے ہوئے دکھایا ہے، اور جن کے بارے میں لوحِ محفوظ پر یہ لکھا ہوا تھا: ان الله یحب الذین یقاتلون فی سبیله صفا کانهم بنیان مرصوص: انھیں ہزیمت خوردہ اور میدانِ جنگ سے پیٹھ پھیرتے ہوئے دکھایا ہے۔ یا للعجب

صحاح ستہ اور دوسری کتبِ احادیث میں سیدنا عثمان غنیؓ کے بے شمار فضائل مرقوم ہیں۔ آپ کامل الحیاء و الایمان تھے، ناشر القرآن تھے، صاحب ہجرتین اور ذو النورین تھے، گزشتہ امتوں میں سے بھی کسی کو یہ شرف حاصل نہیں ہوا تھا کہ ایک نبی کی دو بیٹیاں یکے بعد دیگرے کسی کے عقد میں آئی ہوں۔ جیش عسرت کے وقت انھوں نے سینکڑوں اونٹ سامانِ رسد سے لدے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیے۔ آپ اس موقعہ پر ان سے اس قدر خوش ہوئے کہ آپ بار بار فرماتے تھے کہ آج کے بعد کوئی عمل عثمان کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ انھی کی خاطر بیعتِ رضوان ہوئی تھی۔ شاہ ولی اللہ دہلوی نے ازالۃ الخفا میں ایک حدیث نقل کی ہے کہ جب صحابہ کرام مل کر بیٹھتے تھے تو وہ ابو بکر صدیقؓ، عمر فاروقؓ اور عثمان غنیؓ کو بالترتیب افضل مانتے۔ حضرت عثمانِ غنیؓ کے بارے میں حدیثوں میں بہت کچھ مرقوم ہے لیکن بعض مؤرخوں نے اس امام مظلوم کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ ان پر کنبہ پروری اور اقربا نوازی کے الزامات لگائے اور انھیں کمزور حکمران ثابت کیا۔ میں اکثر حیران ہوتا ہوں کہ جس خلیفے کے عہد میں یزدجرد کو آخری شکست ہوئی اور ایران مکمل طور پر مسلمانوں کے زیرِ نگین آیا۔ جس کے عہدِ معدلت میں پورا افغانستان فتح ہوا اور جس کے عہدِ خلافت میں شمالی افریقہ میں اسلام کا پرچم لہرایا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



جس نے ضعفِ پیری کے باوجود سبائیوں کے آگے ہتھیار ڈالنے سے صاف انکار کر دیا، وہ کس اعتبار سے کمزور رہے ؟ یہاں یہ بات یاد رہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام، سیدنا ابو بکر صدیقؓ اور امیر المومنین عمر فاروقؓ کی عمریں تریسٹھ برس سے زیادہ نہیں ہوئیں، اور ان سب کو اس وقت کام کرنے کا موقعہ ملا جب ان کے قویٰ مضبوط تھے۔ جب کہ عثمانؓ نے تریسٹھ برس کی عمر میں زمامِ خلافت سنبھالی اور بڑھاپے کے عالم میں فاروقِ اعظم کے شروع کیے ہوئے کام کو آگے بڑھایا۔ بیک وقت کئی کئی محاذوں پر کافروں کے دانت کھٹے کیے۔ اب بھی ان مورخوں کو اصرار ہے کہ حضرت عثمانِ غنیؓ کمزور تھے ؟

حضرت عثمانِ غنیؓ کو بڑھاپے کے عالم میں قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے بڑی بے دردی کے ساتھ سبائیوں نے شہید کیا۔ اُن کے خریدے کر وقف کردہ کنوئیں کا پانی ان پر بند کیا گیا۔ اُم المومنین سیدہ ام حبیبہؓ پانی لے کر آئیں تو دشمنوں نے مشکیزہ پھاڑ دیا۔ جس طرح مسجدِ نبوی میں اس امام مظلوم کی توہین کی گئی، اس کا بھی بعض مورخوں نے کوئی خاص نوٹس نہیں لیا۔

حدیث اور تاریخ کے تقابلی مطالعہ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ایسے بہت سے واقعات ہیں جن میں محدثینِ کرام اور مورخین میں اختلاف ہے۔ مثلاً امام محمد بن اسمٰعیل بخاریؒ فرماتے ہیں کہ واقعہ رجیع میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عاصم بن ثابت کو امیر بنایا تھا، ابن اسحاق، ابنِ ہشام اور علامہ ابنِ خلدون کی روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے مرثد کو امیر مقرر فرمایا تھا۔ تاریخ کہتی ہے کہ واقعہ رجیع میں جو چھ صحابۂ کرام شہید ہوئے، انھیں منافقین نے تبلیغ کے بہانے بلایا تھا جبکہ حدیث میں یہ مرقوم ہے کہ ان صحابہؓ کی تعداد دس تھی اور انھیں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جاسوسی کے لیے بھیجا تھا۔

امام بخاریؒ نقل کرتے ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو یہ خوش خبری سنائی گئی کہ جنگ موتہ میں حضرت سیف اللہ خالد کو اللہ تعالیٰ نے فتح دی ہے۔ ابنِ خلدون اور اس کے ہم نوا مورخ لکھتے ہیں کہ اس جنگ میں مسلمانوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا اور حضرت خالدؓ ان کی جانیں بچا کر بمشکل مدینہ لوٹے۔

امام محمد بن اسمٰعیل بخاریؒ، جن کی الصحیح، قرآن مجید کے بعد اصح الکتاب تسلیم کی جاتی ہے، لکھتے ہیں کہ جنگِ اُحد کے ایک سال بعد جنگِ خندق ہوئی تھی۔ جنگِ اُحد بالاتفاق ۳ھ میں وقوع پذیر ہوئی، اس لیے لامحالہ جنگِ خندق ۴ھ میں ہوئی، لیکن ہمارے مورخین، جن میں ابنِ اسحاق اور ابنِ ہشام پیش پیش ہیں، اس پر مُصر ہیں کہ جنگِ خندق شوال ۵ھ میں لڑی گئی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



امام مسلم بن حجاج نیشاپوریؒ، جن کی الصحیح، امام بخاریؒ کی الصحیح کے بعد معتبر ترین حدیث کی کتاب مانی جاتی ہے، فرماتے ہیں کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا عقد ام المومنین سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ فتح مکہ کے بعد ہوا، لیکن تاریخ نگاروں کا کہنا ہے کہ حضرت ام حبیبہؓ فتح مکہ سے بہت پہلے کاشانۂ نبوت میں داخل ہو چکی تھیں اور جب ابوسفیان صلح نامہ حدیبیہ کی تجدید کے لیے مدینہ منورہ پہنچا تو وہ اپنی بیٹی حضرت ام حبیبہؓ کے ہاں ٹھہرا تھا۔ جب ابوسفیان حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بسترِ مبارک پر بیٹھنے لگا تو ام المومنین نے فوراً وہ بستر لپیٹ دیا۔ ابوسفیان نے اس پر احتجاج کیا تو انھوں نے فرمایا کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقدس بستر ہے اور تم کافر اور نجس ہو، اس پر نہیں بیٹھ سکتے۔ ظاہر ہے کہ امام مسلم کی روایت کے مقابلے میں اس کی کیا حیثیت ہو سکتی ہے؟ ان مؤرخوں نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم کی آڑ لے کر حضورؐ کے خسرِ محترم، امیر معاویہؓ کے والد ماجد، آنحضورؐ کی طرف سے نجران کے گورنر، جس کی ایک آنکھ جنگِ طائف میں اللہ کی راہ میں شہید ہوئی اور دوسری آنکھ جنگِ یرموک میں اللہ اور اس کے رسولؐ کا نام بلند کرتے ہوئے شہید ہوئی، کو اپنی ہی لختِ جگر کے ہاتھوں ذلیل و خوار کرا کے اپنے دلوں کی بھڑاس نکال لی۔

امام بخاری کی تحقیق ہے کہ حجاب کی آیات واقعہ افک سے قبل نازل ہوئی تھیں اور واقعۂ افک جنگِ احزاب سے پہلے پیش آیا تھا۔ امام موصوف ہی کی روایت ہے کہ جنگِ احزاب غزوۂ اُحد سے ایک سال بعد ۴ھ میں لڑی گئی تھی۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آیاتِ حجاب کے نزول کا زمانہ ۳ھ اور ۴ھ کے درمیان کا ہے۔ لیکن واقدی اور بعض مؤرخین کہتے ہیں کہ آیاتِ حجاب کا نزول ۵ھ میں ہوا۔

امام بخاریؒ بسندِ معتبر نقل فرماتے ہیں کہ حضرت ابو عامرؓ جنگِ اوطاس میں شہید ہوئے اور ان کے قاتل کو حضرت ابوموسیٰ اشعری نے اسی وقت ٹھکانے لگا دیا۔ ابن اسحٰق اور وہ مؤرخین جنھوں نے ابن اسحٰق کی سیرت کو اپنی نگارشات کا ماخذ بنایا ہے، لکھتے ہیں کہ حضرت ابو عامرؓ کا قاتل بعد میں مسلمان ہو گیا تھا۔

تاریخ میں مرقوم ہے کہ بنو تمیم کا وفد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت بابرکت میں ۹ھ میں حاضر ہوا۔ امام مسلم کی تحقیق ہے کہ قرآن پاک کی یہ آیت لا ترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی اس وقت نازل ہوئی تھی جس وقت بنو تمیم کا وفد حضورؐ کی خدمت [illegible]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



حاضر ہوا تھا۔ مسلم ہی کی روایت ہے کہ اس آیت کے نزول کے وقت حضرت سعد بن معاذ بقید حیات تھے۔ حضرت سعد کا انتقال جنگِ خندق کے فوراً بعد ہوا تھا اس لیے اس آیت کے نزول اور بنو تمیم کے وفد کی باریابی کا زمانہ ۹ھ کی بجائے ۴ھ تسلیم کرنا ہوگا۔

غزوۂ بدر سے قبل حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک فوجی مہم عیص کی طرف بھیجی۔ اس مہم کے قائد سید الشہدا امیر حمزہؓ تھے۔ حضورؐ نے انھیں روانہ کرتے وقت اپنے دستِ مبارک سے علم عطا فرمایا۔ حضرت حمزہؓ مسلمانوں کے اوّلین علم بردار تھے۔ ہمارے ذرائع ابلاغ ہمیشہ یہی کہتے ہیں کہ رجمنٹ کو فوجی جھنڈا عطا کرنے کی رسم کا آغاز غزوۂ خیبر کے موقع پر ہوا اور اس روز حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو علم دے کر اس رسم کا آغاز فرمایا تھا۔ یہ بات ہماری عظیم روایات اور تاریخ کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی۔

ازواجِ مطہرات کو ایک خاص موقع پر یہ اختیار دیا گیا تھا کہ وہ اللہ اور رسولؐ کو اختیار کر لیں یا انھیں چھوڑ کر دنیا کو پسند کر لیں۔ اس واقعہ کو واقعۂ تخییر کہتے ہیں۔ امام مسلم فرماتے ہیں کہ یہ واقعہ آیاتِ حجاب کے نزول سے قبل کا ہے۔ حجاب کا حکم صحیح احادیث کی روشنی میں ۴ھ سے قبل ہوا تھا، اس لیے یہ واقعہ ۳ھ اور ۴ھ کے درمیان کا ہے۔ لیکن دمیاطی اور بعض مؤرخین واقعہ تخییر کا تعین ۹ھ بتاتے ہیں۔ دمیاطی وغیرہ کی روایت درایتاً بھی غلط ہے۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ ۹ھ تک امہات المومنینؓ کے دلوں میں دنیا کی خواہش باقی ہو۔ یتلوا علیھم ایٰتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتب والحکمۃ پر کاربند رسولؐ، جنھوں نے سوا لاکھ صحابۂ کرام کا تزکیۂ نفس کر دیا، اپنی ازواجِ مطہرات کا تزکیۂ نفس ۹ھ تک نہ کر سکے۔ استغفر اللہ۔

امام بخاری ہی کی روایت ہے کہ مشہور تابعی امام مسروقؒ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہدِ خلافت میں مدینہ منورہ آئے اور انھوں نے صدیق اکبرؓ کی اہلیہ محترمہ اُم رومانؓ سے حدیث سنی۔ واقدی وغیرہ اپنی تاریخوں میں لکھتے ہیں کہ موصوفہ کا انتقال ۴ھ اور ۶ھ کے درمیان ہو گیا تھا، لہٰذا امام مسروقؒ سے ان کا لقا ثابت نہیں۔ امام ابن القیمؒ نے صحیح اسناد کے ذریعے امام مسروق کا حضرت اُم رومان سے عہدِ صدیقی میں لقا ثابت کیا ہے۔ واقدی محدثین کی نظر میں ناقابلِ اعتبار ہے۔

امام بخاری بسندِ معتبر نقل کرتے ہیں کہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ غزوۂ خیبر کے بعد مدینہ منورہ آئے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



اور اس کے بعد انھوں نے غزوہ ذات الرقاع میں شرکت کی۔ ابن اسحٰق، ابنِ ہشام اور ان کی روایات کو ماخذ بنا کر تاریخیں مرتب کرنے والے مؤرخین لکھتے ہیں کہ غزوہ ذات الرقاع غزوہ خیبر سے قبل ہوا تھا۔

امام بخاری فرماتے ہیں کہ قرآن مجید کی یہ آیت اِنَّ الَّذِیْنَ یَشْتَرُوْنَ بِعَھْدِ اللّٰہِ وَ اَیْمَانِھِمْ ثَمَنًا قَلِیْلًا ۔ حضرت اشعث بن قیس اور ان کے چچا زاد بھائی کے مقدمے کے سلسلے میں نازل ہوئی تھی۔ طبری اور بعض دیگر تاریخ دان کہتے ہیں کہ یہ آیت یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی تھی، جب کہ انھوں نے قسمیں کھا کھا کر کہا تھا کہ تورات مقدس میں حضورؐ کا ذکر نہیں ہے۔

یہ روایت کتبِ احادیث میں بسندِ معتبر منقول ہے کہ جب حضرت عمرِ فاروقؓ سے ان کے جانشین کے بارے میں استفسار کیا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ عثمانؓ، علیؓ، طلحہؓ، زبیرؓ، عبدالرحمٰنؓ اور سعد بن ابی وقاصؓ موجود ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی وفات تک ان سے خوش رہے۔ ان سے زیادہ خلافت کا کوئی مستحق نہیں، لہٰذا یہ اپنے میں سے جس کو چاہیں خلیفہ بنا دیں۔ لوگوں پر واجب ہے کہ اس کی اطاعت کریں۔ استیعاب کے مصنف ابنِ عبدالبر رقم طراز ہیں کہ جب حضرت عمر فاروقؓ سے ان کے جانشین کے بارے میں سوال کیا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ چھ آدمی موجود ہیں جو خلیفہ بننے کے لائق ہیں، لیکن ان میں سے کسی ایک کا نام تجویز کرنا مشکل ہے۔ ان میں (معاذ اللہ) کوئی نہ کوئی نقص موجود ہے۔ حضرت علیؓ میں ظرافت بہت ہے۔ عثمان غنیؓ ابو معیط کی اولاد کو لوگوں کی گردنوں پر سوار کر دیں گے۔ یہ لوگ اللہ کی نافرمانی کریں گے اور لوگ عثمان پر ٹوٹ پڑیں گے اور انھیں قتل کر دیں گے۔ طلحہؓ بہت مغرور ہیں۔ زبیرؓ صارع اور رمد میں لوگوں کے طمانچے ماریں گے۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ زبیرؓ اس وجہ سے لائق خلافت نہیں کہ وہ سارا دن بازار میں اشیا کے بھاؤ دریافت کرتے رہتے ہیں۔ سعدؓ بن ابی وقاص صرف لڑنا جانتے ہیں، سیاست کو نہیں سمجھتے۔ عبدالرحمٰنؓ ضعیف ہو چکے ہیں، اس لیے بارِ خلافت ان کے بس کا روگ نہیں۔ مسئلہ خلافت پر کتابیں لکھنے والے سیاسی مفکرین نے بھی اس روایت کو بہت اچھالا ہے۔ کسی نے یہ نہیں سوچا کہ ابن عبدالبر کی اس روایت سے اہل بدر اور عشرہ مبشرہ کی تنقیص کا پہلو نکلتا ہے اور ان کی دیانت اور امانت مجروح ہوتی ہے۔

اس ضمن میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ محدثین کرام نے اپنی روایات کو بڑی چھان بین اور راویوں کے سیرت و کردار اور امانت و دیانت پر جرح کرکے ہی اپنی لازوال کتابوں میں شامل کیا ہے جبکہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



مؤرخوں نے طیور پر اعتماد کر کے اڑتی سی خبریں بھی اپنی تاریخوں میں شامل کر لی ہیں۔

آخر میں ایک بات عرض کرنی ضروری سمجھتا ہوں کہ جس طرح محدثینِ کرام اور مؤرخین میں اختلاف ہے، اسی طرح محدثینِ کرام اور سیرت نگاروں میں بھی اختلاف ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ بعض محدثین کو ایسی روایتیں مل گئیں جن کا راوی عینی شاہد تھا اور بعض محدثین اور سیرت نگاروں نے ایسے راویوں سے روایت لے لی جو اس موقعہ پر موجود نہ تھے لیکن انھوں نے وہ واقعہ کسی سے سنا تھا، اس لیے اختلاف ہونا ضروری تھا۔ بسا اوقات محدثینِ کرام میں بھی اختلاف ہو جاتا ہے۔ اس کے ذمہ دار محدثین نہیں بلکہ راوی ہوتے ہیں۔ (بشکریہ ریڈیو پاکستان، لاہور)

---

# برصغیر پاک و ہند میں علم فقہ

محمد اسحاق بھٹی

اس کتاب میں سلطان غیاث الدین بلبن (۶۸۶ھ) کے عہد سے لے کر سلطان اورنگ زیب عالم گیر (۱۱۱۸ھ) کے عہد تک کی تمام فقہی مساعی کا احاطہ کیا گیا ہے اور تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ برصغیر پاک و ہند علم فقہ سے کس طرح روشناس ہوا، یہاں کے علما و زعما نے کس محنت و جاں فشانی سے اس کی ترویج و اشاعت کا اہتمام کیا اور کن اہم فقہی کتابوں کی تدوین کی۔ برصغیر پاک و ہند کے جن سلاطین کے دورِ حکومت میں، کتب فقہ مرتب کی گئیں ان کے عہد اور طریقِ حکومت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس زمانے کے علمائے کرام کے حالات بھی بیان کیے گئے ہیں اور یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ یہ حکمران علم و علما سے کس طرح کا تعلق و ربط رکھتے تھے۔ پھر فقہ کی جن کتابوں کا تعارف کرایا گیا ہے، اس کے اہم اقتباسات بھی فاضل مصنف نے درج کتاب کیے ہیں۔ آخر میں فقہ کی ان مشہور اکیاسی کتابوں کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کی گئی ہیں، جو مختلف ملکوں میں تصنیف کی گئیں، جن کو مسائلِ فقہ کے اصل ماخذ کی حیثیت حاصل ہے۔ اس موضوع سے متعلق اردو زبان میں یہ پہلی کتاب ہے۔

صفحات: ۴۰۸ قیمت: پندرہ روپے

ملنے کا پتا: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور

© rasailojaraid.com